ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محمد حسن عسکری کی معنویت: کل اور آج

The age in which Muhammad Hassan Askari began his writing career was marked a literary milieu born of Western intellectual, cultural and critical ideas. In such a situation, he laid emphasis on the creation of such literature which could reflect and embody a clearly distinct Eastern spirit. During the Pakistan movement and afterwards, he highlighted the need for a literature which, along with representing the collective longings of the Muslims of the Subcontinent, would be in tandem with the collective aspirations of Pakistani nation. To him, literature should not only impregnated with aesthetic values but also reflect social experimentations and transnational conditions. The criticism he produced is a testament to his extraordinary mindfulness and deep awareness.

In this paper, it has been discussed as to how the issues Askari wrote about are meaningful and relevant not just to his age but also to our times. Most of such issues are extremely pertinent to contemporary conditions and, in his writings, one can discern an effectively spelled out futuristic vision.

ہم نے اپنی ایک کتاب اردو تنقید: چند منزلیں[۱] میں اس امر پر تفصیلی بحث کر کے کہ اردو کا قدیم شعری سرمایہ، تنقیدی شعور سے عاری نہیں تھا، اُس تنقیدی شعور کی موجودگی، نوعیت اور طریق کار کا ایک مفصل جائزہ پیش کیا تھا۔ اس کے بعد اُس کلاسیکی شعری وتنقیدی سرمائے کی ساکھ خراب کرنے والی نیک نیت کاوشوں کے طور پر محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالؔی کے تنقیدی سرمائے پر نظر ڈالتے ہوئے یہ دیکھا تھا کہ انیسویں صدی کے نو آبادیاتی مغربی نظریات کے وضع کاروں -- ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ -- نے کس طرح ہمارے ان بزرگوں سے وہ کچھ کہلوایا جو وہ چاہتے تھے اور پھر شبلی نعمانی نے بھی کس طرح آزادؔ اور حالؔی کے بنا کردہ خطوط پر عمارت اٹھائی۔ اسی ذیل میں چند دیگر ناقدین کے خیالات کا بھی جائزہ لیا گیا تھا۔ اُس کتاب میں ہم نے آزاد اور حالی سے شروع ہونے والی تنقیدی سرگرمیوں کے منفی پہلوؤں پر زیادہ کلام اس لیے کیا تھا کہ انہی کے زیر اثر ہمارے کلاسیکی سرمائے کی بے اعتباری شروع ہوئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے ان بزرگان ادب میں کوئی خوبی وکمال تھا ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملّی و مذہبی امور، مشرقی اقدار، قوم کی اصلاح وفلاح، اپنی ادبی روایات سے ہمدردی، عام زندگی و زبان کے احترام، ذاتی زندگی میں

بے غرضی و بے نفسی اور اپنے ہم وطنوں کا سچا دکھ درد جیسا ان بزرگوں اور بطور خاص حاؔلی میں تھا وہ بعد کے لوگوں میں کم ہی ہوگا۔ مگر باہمہ احترام و ہمدردی ، ان بزرگان ملت وادب نے شعر وادب کو پرکھنے کے جو معیارات اختیار کیے تھے، افسوس کہ وہ ، بقول شیخ اکرام، صحت مند اور ترقی پسندانہ تو تھے مگر ہماری قومی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھے۔[۲] اسی طرح ڈاکٹر صادق کا بھی یہی خیال ہے کہ لاہور میں نئی شاعری اور اس کے معیارات کا جو نیا مکتب وجود میں آیا تھا وہ ہمارے قومی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ نہیں تھا، بلکہ سرکار انگلشیہ کی ایما سے شروع کیا گیا تھا۔[۳] یاد رہے کہ شیخ اکرام اور ڈکٹر صادق حالی اور آزاد کے مخالفوں میں سے نہیں بلکہ ان سے ہمدردی رکھنے والوں میں تھے۔ ہمارے ان لائق صد احترام بزرگوں کی اجتہادی غلطی صرف یہ تھی کہ باجبروت نوآبادیاتی حاکمِ وقت کے چشم وابرو کے اشاروں کو انہوں نے اپنے من کی پکار بنالیا تھا۔

نوآبادیاتی دور کے ختم ہونے پر دنیا بھر میں ''پس نو آبادیاتی مطالعات'' کے عنوان سے ایک پورا شعبہ علم وجود میں آچکا ہے جس میں یہ دیکھا جاتا ہے یا اس نکتے کو مطالعے کا مرکزی حوالہ بننا چاہیے کہ ہمارا وہ کونسا سرمایۂ حیات تھا جسے نو آبادیاتی علوم وافکار نے ہماری نظروں میں اس طرح بے اعتبار کر دیا کہ ہم اپنے علوم اور تمدنی وثقافتی تصورات سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں اور یہ کہ آیا کیا آج پس نوآبادیاتی عہد میں ہمارے لیے یہ ممکن رہ گیا ہے کہ ہم اپنے قبل استعماری رنو آبادیاتی عہد کے تصور کائنات وحیات کا کمی شعور پیدا کرسکیں اور اپنے اس گم شدہ سرمایے کو دوبارہ بحال کرسکیں۔ ''پس نو آبادیاتی مطالعات'' میں اس نکتے کو اگر مرکزی مسئلہ قرار دیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جدید اردو تنقید میں ہمارے روائتی تصور حیات وکائنات کو زندہ و بحال کرنے کا احساس سب سے پہلے صرف اور صرف محمد حسن عسکری نے پیدا کیا ہے اور محمد حسن عسکری نے اس حوالے سے اردو تنقید میں جو کارنامہ سرانجام دیا اس کی معنویت کے دو رخ تھے: موضوعاتی اوراسلوبی۔ انہوں نے صرف یہی نہیں بتایا کہ اپنی تہذیبی روایات اور ادبی اقدار کے حوالے سے ہم غلط رخ اختیار کر چکے ہیں، بلکہ یہ بات انہوں نے جس انداز ،اسلوب اور لب ولہجے میں کہنا شروع کی وہ سامراجی اقتدار ،تمدن اور انگریزی زبان و ادب کے بالفعل تسلط کے عروج میں نادر ونایاب تھا جب ہر طرف انگریزی زبان کی برتری اور مرعوبیت کی فضا تھی ایسے میں عسکری نے مغربی شعور سے ہنسی مذاق اور بے تکلفانہ چھیڑ چھاڑ شروع کردی تھی۔ آزاؔد اور حاؔلی کو جب بھاشا کی سادگی کا نمونہ صرف انگریزی میں نظر آرہا تھا اور وہ اردو کو اس کی تقلید کا مشورہ دے رہے تھے، پھر جب مغربی ادب وشعور کے تتبع میں نئے ادب والوں کے پاس ترقی پسندی کا واحد معیار مغربی افکار ونظریات تھے، تب عسکری نے جزیرے کے اختتامیے میں نئے ادب کے غالب عنصر اور ذہنی ماحول کو پچھتر فیصد مغربی کہا تھا اور ہندوستان کے لیے ایک نئے شعور کی ضرورت کی بات کر کے اردو ادب کے روایتی دھاروں سے واقفیت کو ضروری قرار دیا تھا۔ لیکن اس وقت کے ایک انگریزی شناورادب،عزیز احمد، تک نے عسکری پر طنز کرتے ہوئے ان کے طرز تحریر کو مجہول قرار دے کر لکھا تھا کہ ''باقی رہ گیا 'شعور' تو نہ وہ مغربی ہے نہ مشرقی ، وہ ایسی کلیت ہے جس کے پچھتر اور پچیس ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔عسکری نے کتابیں پڑھی ہیں ...لیکن زندگی کا مطالعہ انہوں نے بہت کم کیا ہے۔''[۴]

عسکری نے زندگی کا مطالعہ کیا تھایا نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ مغربی ادب وافکار کے ساتھ بے تکلفی اور غیر مرعوبیت

کے اس رویے کی بدولت ہی انہوں نے بعد میں مغربیت کے چولے کو تار تار کر دیا تھا۔ اور اسی ''پاؤ اور پونے شعور'' کے احساس کے تحت ہی پورے مشرقی شعور اور زندہ مابعدالطبیعیات کی دریافت کرنے میں کامیاب ہوسکے تھے۔(ایسے میں عزیز احمد سے سوال ہوسکتا ہے کہ شعور اگر ایک کلیّت ہے، جو نہ شرقی ہے نہ غربی، تو وہ خود آخر میں 'ماہر اسلامیات اور اسلامی جدیدیت کے پارکھ' کیسے بن گئے تھے؟) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے بزرگ جب ہمیں انگریزیت کے راستے پر ڈال گئے تھے تو یہ عسکری ہی تھے جنہوں نے کم از کم نظری سطح پر یہ راستہ کاٹنے کی جرأت کی تھی۔

آزادؔ اور حالیؔ وغیرہم کے بارے میں ہمارا یہ خیال کہ انہوں نے اپنے ادبی شعور کو انگریزی معیاروں پر پرکھنے کے ناروا عمل کا آغاز کیا تھا، اس وقت سخت مشکل کا شکار ہوجاتا ہے، جب عسکری کے بعض ناقدین کا یہ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ خود عسکری نے بھی تو اردو ادب، بالخصوص شاعری وغزل کو مغربی فکشن سے ماخوذ شعور کی سان پر چڑھانے کی کوشش کی ہے۔[۵] اگر سابقین کا یہ عمل درست نہیں تھا تو عسکری کے اس عمل کا جواز کیا تھا؟ اس مخصوص تناظر اور نتائج سے قطع نظر جس میں یہ نکتہ اٹھایا گیا ہے، اس ضمن میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات اور پیش آمدہ مسائل کی روشنی میں اپنے تصورات اور خیالات کی نئے سرے سے جانچ پرکھ کرنے کا اصول اساساً غلط نہیں، بلکہ یہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ نئے حالات میں بھی ان کی قوتِ حیات کو اپنی فعالیت ثابت کرنے کا موقع مل سکے۔ ہمارے اعتبار سے جو شے غلط ہے وہ ایک بالکل مختلف تناظر اور اجنبی تصور حیات و کائنات پر مبنی اصول پر اپنی روایات و اقدار کو پرکھ کر ان کے اندر عیوب تلاشنا اور اپنے سرمایۂ فکر و عمل کے بارے میں احساس کمتری کے روّیے کو عام کرنا ہے، جو آزادؔ و حالیؔ سے شروع ہونے والے اور بعد کے ترقی و جدیدیت پسند رویوں نے کیا اور عسکری نے بالکل نہیں کیا۔ عسکری کے ہاں جب بھی ایسی صورت ہوئی انہوں نے ہمیشہ اپنے کلاسیکی تصورات، اسالیب، اصناف سخن اور شاعری (بصورت میرؔ یا غالبؔ کی جدیدیت) کی کوئی نئی معنویت یا برتری کی کوئی نئی جہت دریافت کی ہے۔ اپنے پورے تنقیدی سفر میں انہوں نے کسی ایک موقعے پر بھی کلاسیکی مشرقی اقدار کو نہ ''دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے'' قرار دیا ''نہ سنڈاس کے دفتر''، بلکہ انہوں نے تو مشرقی اقدار کی برتری ہی جتلائی ہے جو نشاۃ ثانیہ سے قبل مغربی شعور کا بھی اسی طرح جزو لاینفک تھیں۔ مغربی تصورات و خیالات کو اگر انہوں نے رد کیا ہے تو ان ابدی و آفاقی معیارت کی بحالی پر اصرار کے ساتھ، جو اپنی اصل میں نہ مشرقی ہیں نہ مغربی بلکہ جو ماورائے منبع انسانی ہیں۔ اس لحاظ سے آزادؔ و حالیؔ کی ادبی و نظری قدریں جہاں اپنی قومی روایات کی قیمت پر صرف صحت مندانہ و ترقی پسندانہ تھیں، وہاں عسکری کی کاوشیں صحت مند و ترقی پسندانہ ہوں نہ ہوں، کم از کم اپنی قومی روایات کے منافی ہرگز نہ تھیں۔ اور ان کا دور آخر والا موقف تو صراحتاً مغربی اقدار کے مقابلے میں مشرقی اقدار کی برتری کا تھا۔

کلاسیکی مشرقی شعریات میں موضوع ومعنی کے مقابلے میں زبان کے لفظی کھیل، اسلوب وہیئت اور بات کہنے کے انداز کو برتری حاصل تھی۔ لیکن یاد رہے کہ وہاں موضوع، معنی، مضمون، مواد، ثقافتی اقدار، تمدنی معیارات اور اخلاقی تصورت حیات کو کبھی غیر اہم نہیں سمجھا گیا تھا۔ اُس شعریات کے پیچھے ایک خاص تصور کائنات، زندگی کے بارے میں ایک بلند نقطۂ نظر اور جذبات کا خاص کلچر بھی کارفرما تھا، جس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی تھی۔ اس شعریات کے بانی امیر

خسرو نے اپنے دیوان *غرۃ الکمال* کے دیباچے میں جب اچھے کلام کے لئے' شعراء کی نہج پر ہونے اور واعظوں کے طریق پر نہ ہونے' کی شرط لگائی تھی ،تو اس میں نفی واعظوں کے مواد ، موضوع اور مافیہ کی نہ تھی بلکہ ان کے طریق، طرز ادا اور نہج کی تھی ۔خسرو ہی سے استفادہ کرتے ہوئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ بزرگ تر معاملات اور بلند ترین سروکار جن کا دوسرا نام حکمت ہے، جو شعر کے تہہ دار مفہوم میں شامل ہے اور جو واعظوں کا بھی موضوع اور مواد ہوتے ہیں، انہی کو شعرا کی' نہج' اور' طریق' پر ادا کرنے سے عمدہ استادانہ کلام وجود میں آتا ہے ۔جس شعریات کا بانی شعر کے اسلوب اور ہیئت کے امتیاز کے ساتھ ساتھ اس موضوع اور مواد میں حکمت کی شمولیت کو بھی ضروری جانتا ہو اور اس طرح شعر کی جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ غیر جمالیاتی اقدار (موضوع، مواد، حکمت) کو بھی اتنا ہی اہم مقام دیتا ہو۔[6] صدیوں بعد اسی شعریات کا ایک طالب علم محمد حسن عسکری اپنے دور کی بہترین لفظیات میں اگر یہ کہے کہ کسی شعر کے شعر ہونے کا فیصلہ اس کے فنی معیارات پر مگر اس کے عظیم شعر (جو ظاہر ہے کہ شعر کے مافیہ، معنی، مضمون یا کچھ' بزرگ تر معاملات' ہی کی وجہ سے ہوگا) ہونے کا فیصلہ غیر فنی معیارات پر ہوگا۔[7] تو اسے اپنی کلاسیکی شعریات کا کامیاب بازیافت کنندہ تو کہا ہی جائے گا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب مغربی اصول وقواعد ہی کو معیار قرار دینے کے زمانے میں وہ اس امر کو بھی بطور ایک اصول کے قائم کردے کہ' ہر تہذیب کو اپنے ادبی معیار خود متعین کرنے کا حق حاصل ہے' تو اس تجدیدی کارنامے پر اسے اپنے دور کا مجدد ادب بھی کہہ دیں تو غلط نہیں۔ اس اصول میں نہ صرف اردو زبان وادب کے حال و مستقبل کو محفوظ کرنے کی منطق موجود ہے بلکہ اس اصول سے کلاسیکی تنقیدی شعور کے وجود، نوعیت اور طریق عمل کو جاننے کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے ۔

عسکری کی تنقید میں یہ تو دوسروں کے لیے بحالی اعتماد کی بنیاد تھی۔ جہاں تک ان کا اپنا معاملہ تھا، وہ ۱۹۴۶ء میں'' ہندوستانی ادب کی پرکھ'' نامی'' جھلکیاں'' میں اس طرف علمی و منطقی ہی نہیں'' وجودی'' اشارے بھی کر چکے تھے اور زور دار طریقے سے کلاسیکی اردو شاعری میں تنقیدی شعور کی موجودگی ،نوعیت اور طریق کار کا اثبات کیا تھا۔ان کے اس مضمون میں ان کے اپنے تنقیدی منہاج کی تفہیم کا بھی بہت سامان موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> '' کوئی شعر سن کر اگر کسی آدمی کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے تو یہ امر بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر تنقیدی شعور ہے، خواہ وہ ناقص اور غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔کسی قوم میں ادب کا وجود ہی بتاتا ہے کہ اس قوم میں ادب کی پرکھ کے کچھ نہ کچھ معیار ضرور موجود ہیں، خواہ یہ اصول اتنے جامع اور ترقی یافتہ نہ ہوں جتنے کسی اور قوم میں...کمی ہمارے ہاں یہ رہی ہے کہ مغرب کی طرح اس شعور کو عقلی اصطلاحوں میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کچھ تو یہ بات بھی ہے کہ مشرقی لوگوں کی افتاد طبع تجزیہ کو پسند نہیں کرتی ...مغرب کے مقابلے میں مشرق تجزیے کے بہ نسبت تصوف کا زیادہ قائل ہے ۔مشرق کو چیزوں کو الگ الگ کرنے سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی انہیں جوڑنے سے ہے''۔ ۸

لہٰذا اردو کلاسیکی تنقید کے تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ عسکری کے تصورات نہ صرف اس سے ہم آہنگ تھے بلکہ اُسے بے اعتبار ٹھہرائے جانے کے زمانے میں انہوں نے نہایت شدت کے ساتھ اس کے جواز ،درستی اور نوعیت کا برملا اظہار کیا اور

اپنے زمانے کے نئے نظریات و مباحث کی روشنی میں بعض پہلوؤں سے اس میں اضافہ بھی کیا: جیسے ادب میں زندگی اورانسانی فکروعمل کے دیگر مظاہر کے انعکاس کا تصور۔ہمارے پرانے ادب وشاعری میں زندگی کے اظہار کے مسائل تنقیدی طور پر زیر بحث نہیں آتے تھے ،کیونکہ ایک تو یہ اس دور کے مسائل ہی نہیں تھے دوسرے یہ سب کچھ وہاں تخلیقی طور پر برتا جا رہا تھا۔لیکن جس طرح اُس دور میں جمہوریت کا تصور نہ ہونے کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ اگلے وقتوں میں عامتہ الناس پر محض ظلم ستم ہی ہوتا ہوگا اور ان کے حقوق کے تحفظ وشنوائی کی کوئی صورت نہ ہوگی ،اسی طرح اُس ادب میں زندگی اور اس کے متعلقہ مسائل کے انعکاس کی تنقیدی بحثیں نہ ہونے کا مطلب بھی یہ نہیں کہ پرانا ادب زندگی کے مختلف مظاہر سے یکسر خالی تھا۔لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں ترقی پسندی کے آغاز کے دور میں یہی سمجھا گیا تھا۔کیونکہ ترقی پسندوں نے جن مخصوص اشتراکی آدرشوں اور مارکسی تصورات کو زندگی کے واحد محرکات وموثرات حیات سمجھ لیا تھا اور انہیں جس طریقے پر ادب میں منعکس دیکھنا چاہتے تھے، وہ سب کچھ کلاسیکی ادب میں نہیں تھا۔یہ سوچے بغیر کہ یہ اس دور کے مسائل ہی نہیں تھے،کلاسیکی ادب کو رد کر دیا۔

اب جبکہ نئے زمانے میں ادب اور زندگی کے تعلق پر علمی وتنقیدی بحثیں ہونے لگی تھیں،عسکری نے ادب میں زندگی کے اظہار، زندگی کی تفسیر وتنقید میں ادب کے کردار اور ادب کے طریق انقلاب وتبدیلی پر وہ تنقیدی بحثیں لکھیں جو ان کے مضامین'' مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی'' اور'' ادب اور انقلاب'' کی صورت میں آج بھی پڑھنے والے کو ہتلائے حیرت کردیتی ہیں۔ علاوہ ازیں ادب اورفن میں جذبات کی تنظیم وتجسیم کا وہ سارا تصور،جوعسکری کے ہاں آرٹ اور تخلیقی عمل والے مباحث میں آتا ہے، ادب میں زندگی کے اظہار کے طریقوں پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔[9] اُس زمانے میں جب اشتراکی معاشرے کے قیام کے سلسلے میں ادب کو اس کا خادم بنا کر یا تو اس سے خیالی فردوس کے نغمے گوائے جارہے تھے یا پھر ماضی کے قدیم غیر اشتراکی تمدن کی تنقید بلکہ تنقیص کا فریضہ ادا کروایا جارہا تھا،عسکری نے ادب میں زندگی کا عکس دیکھنے کے لیے ادب کو پڑھنے کا طریقہ بھی سمجھایا اور چند مخصوص مارکسی آدرشوں سے ہٹ کراس فطری اور حقیقی زندگی کی مختلف صورتوں سے آشنا کیا جو نظریوں اورنعروں کی مرہون منت نہ تھی بلکہ جو فرد اور معاشرے کے باہمی رشتے کی ان گنت شکلوں سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ یہ تو تھا کلاسیکی ادب کے بارے میں عسکری کے'' موضوع اور مواد'' کا معاملہ ؛ یہ باتیں کہنے کے لیے انہوں نے جو تنقیدی منہاج اختیار کیا وہ بھی مشرقی مزاج اور پرانے اساتذۂ فن کے طریق تنقید کے مطابق تھا۔

البتہ ادب اور زندگی کے تعلق کے ساتھ ساتھ انہوں نے فنکار اور معاشرے کے تعلق، فنکار اورفن کے مابین تعلق کے اُن مسائل کو اپنی تنقید میں خصوصی اہمیت دی جن پر سابقہ ادوار میں علم نفسیات پراس گہرائی سے غور وخوض نہ ہونے کی وجہ سے آج کی طرح سوچانہیں گیا تھا۔عسکری کا کہنا تھا کہ تخلیقی فعل انسانی دماغ، اس کی بناوٹ اور عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے مغرب کی طرح مشرقی تنقید کو بھی انسانی دماغ اور اس کی حیاتیاتی ساخت کے ساتھ تخلیقی عمل کے تعلق پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔ انہوں نے خود بھی تخلیقی عمل اور تجربے کی ماہیت سے تعلق رکھنے والی اس تنقید پرخصوصی توجہ دے کر کلاسیکی تنقیدی شعور میں موجود اس'' کمی'' کوحتی الوسع پورا کیا۔لیکن یہاں بھی انہوں نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ چونکہ نفسیاتی

تشریحات کے ذریعے کسی ادب پارے کی جمالیاتی قدر قیمت کا تعین بالکل نہیں ہوسکتا اور تخلیقی تجربے کی ماہیت اور اس کی جمالیاتی قدر و قیمت دو الگ الگ چیزیں ہیں، اس لیے، صرف نفسیاتی تنقید پر قناعت نہ کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ادب کی جمالیاتی قدر کا تعین کرنے والی تنقید چونکہ ہمارے قدیم شعور کے پاس وافر تھی اس لیے عسکری نے تخلیق کی نفسیات سے بحث کرنے والی اس تنقید کو اردو میں خصوصی طور پر استعمال تو کیا لیکن اس سے اپنے تمام تر شغف کے باوجود وہ یہی کہتے نظر آئے کہ ''عمرانیات نفسیات اور حیاتیات میں تو ادب کو برقرار رکھنے کا کوئی لازمی جواز نہیں ملتا''۔[۱۰] کیونکہ فنی تخلیق اور انسانی شعور کا باہمی رشتہ ایک ایسی بنیاد پر قائم ہے جس کے تعین میں حیاتیات ونفسیات ابھی تک ناکام ہیں۔ لہٰذا وہ اسی طرف لوٹتے ہیں کہ فنی تخلیق فنکار کے اندر ایک الوہی صفت کے طور پر کام کرتی ہے اور ایک محدود معنی میں فن اپنا جواز خود ہے۔مگر عسکری کا یہ کہنا ''فن برائے فن'' کے مفہوم میں نہیں تھا، بلکہ اس کی تشریح حقیقت کے مدارجی و مراتبی تصور کی روشنی میں ہوسکتی ہے۔اس امر سے قطع نظر کہ عسکری کی یہ دریافتیں درست ہیں یا غلط، اہم بات یہ ہے کہ اردو کے کلاسیکی شعور میں اگر ان مباحث کی کمی تھی تو اسے عسکری نے اس طور پر دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا آخری مفاد مشرقی روح کے مطابق بھی ہے اور اس کا مجموعی تاثر اپنی پرانی اقدارِ حیات و جمالیاتِ فن کے بارے میں بے اعتباری کا بھی نہیں۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ ابتدائے کار ہی سے ایک منصوبہ بند طریقے پر مشرق کی برتری جتلانے کی مہم پر نکلے تھے۔ اصل میں ان کا ہر خیال اور تصور اپنے زمانے کے موجود چیلنجوں سے نبرد آزمائی کے دوران تشکیل پاتا تھا۔ کیونکہ بعض سوالوں کے بنے بنائے جواب یا تو ہوتے ہی نہیں یا وہ کسی خاص صورت حال میں تسلی بخش نہیں رہتے۔اس لیے نئے جواب گھڑنے پڑتے ہیں یا پرانے جوابوں میں کتر بیونت کر کے کام چلانا پڑتا ہے۔ ہر دو صورت میں یہ امکان رہتا ہے کہ ایک وقت کا موقف کسی اگلی صورت حال میں پوری طرح درست نہ بیٹھے اور اس میں بھی کاٹ چھانٹ کرنی پڑے۔ اپنے خیالات میں تراش خراش کا یہ عمل عسکری کے ہاں خاصا ہے۔ ان کی ذہنی بے چینی ابتداء ہی سے کسی خاص منزل کی متلاشی تھی، جس کی کوئی متعین صورت ان کے اوپر ''منکشف'' نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی عصبی تجربات کو اہم جاننے والے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کے لیے کسی انکشاف کا حاصل اتنا اہم نہ تھا، جتنا انکشاف تک پہنچنے کا تجربہ اور مرحلہ وار عمل۔ ہمیں معلوم ہے رینے گینوں سے ان کی واقفیت ۴۷-۱۹۴۶ء سے تھی۔ مگر اس کے ''انکشافات'' کو عسکری نے اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک وہ خود مغربی طرز احساس کے مطابق جو مشرق کے بنیادی سروکار ''وجود'' کے برعکس ''وجود میں آنے کے عمل'' کو دیکھتا ہے۔[۱۱] جدیدیت کے ریگزار سے اس کی بے حاصلی کے عمل کو حسی تجربہ بنا کر اپنے شعور اور وجدان سے نہ گزار چکے تھے۔ چونکہ ان کا سفر محض تفریحی نوعیت کا نہ تھا اور وہ اس کے حاصلات سے سرسری گزرنے کے قائل نہ تھے، اس لیے انہوں نے اس سفر کے مختلف مراحل پر پڑاؤ بھی کیا، مشرق و مغرب کے امتزاج کے بھی خواہاں ہوئے اور ہیئت کو کل آرٹ ماننے کی انتہا تک بھی پہنچے۔ یہ سب ان کی سچی لگن کے ہی شاخسانے تھے۔

ز نقص تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دلت فریب اگر جلوہ سراب نہ خورد

لیکن اس سے پہلے ۱۹۴۴ء میں وہ چونکہ 'پرچاری ادب' کی گنجائش بھی دکھا چکے تھے، اس لیے ۱۹۴۶ء میں ہی ہیئت کو نیرنگ نظر کہہ کر انہوں نے خالص جمالیات ہیئت کو ادب میں ایک ایسا سراب قرار دیا جس میں ذرا بھی اصلیت نہیں۔ اس طرح ہیئت کو انہوں نے نئی اخلاقی معنویت کی تلاش کا ایک ذریعہ بھی کر دکھایا تھا۔[۱۲]

بدلے ہوئے حالات میں ان کے خیالات میں تاکید و اصرار کا فرق تو ضرور پیدا ہوتا تھا، مگر ان کے کسی بعد کے تصور کا جواز ان کے پہلے موقف میں بھی اکثر مل جاتا ہے۔ ادب و فن کے منصب اور وظیفے کے بارے میں ان کے خیالات اگر کسی ایک انتہا (ہیئت ہی کل آرٹ) پر پہنچے بھی تھے تو ان کا دورانیہ شروع کے دو تین برس سے زیادہ نہ تھا اور اس میں بھی حیرت انگیز طور پر دوسری طرف (ہیئت = اخلاقی معنویت کی تلاش) کے آثار موجود تھے، جس پر وہ عمر بھر قائم رہے۔[۱۳] علاوہ ازیں عسکری ان کے بار بار خیالات بدلنے والی بات جس کا مقصد ان کے ''تضادات'' کو اچھالنا ہوتا ہے، اگر درست ہے تو یہ بھی اتنا ہی درست ہے کہ ان کے ہاں درجنوں امور ایسے ہیں جن پر ان کے خیالات کبھی تبدیل نہیں ہوئے تھے۔

عسکری کی ادبی زندگی کا آغاز ایک تخلیق کار کے طور پر ہوا تھا۔ ان پانچ سات برسوں میں ''جدیدیت'' کی روح کو انہوں نے اپنے فنی شعور میں بعض اعتبارات سے اس طرح سمویا تھا جس طرح میرا جی نے اپنی شاعری میں کر دکھایا تھا، کہ ان کی زندگی اور فن ایک دوسرے کا مثیل ہو گئے تھے۔ لیکن اُس دور میں بھی کھلی آنکھ رکھنے والے ان کے تنقیدی شعور نے جدیدیت کے سب سے بڑے امتیاز -- ہر قدر کے انکار کی قیمت پر صرف اپنی انفرادیت اور عظمت کا اثبات -- سے خود کو الگ کر لیا تھا اور اپنے اساتذہ کی بدولت وہ ان عظیم سایوں کے احساس کی ضرورت کے قائل ہوئے جن کی طرف جزیرے کے اختتامیے میں تو انہوں نے اشارے ہی کیے، مگر ایک بہت بعد کی تحریر ''بے تکلف گفتگو''[۱۴] میں تفصیلاً بتایا تھا کہ یہ مشرق، فارسی شاعری اور قدیم ادب کی جلیل القدر ہستیاں تھیں۔ ان دیو قامت افراد سے اپنا قد ماپتے رہنے کی بدولت ہی وہ کبھی بھی خبط عظمت کے احساس اور ادب میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کی دھن میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس طرح ادب کے بارے میں ان کے اس خیال کی بنیادی اینٹ تو گویا ۱۹۴۳ء میں ہی رکھی گئی تھی کہ یہ ایک اجتماعی سرگرمی ہے۔ اپنے اساتذہ کے فیض سے انہوں نے فارسی شاعری کی عظمت کان دبا کر مان تو لی تھی، مگر اپنی مغربی حسیّت کی وجہ سے وہ اس کے اندر نہ اتر سکے اور یہ اصول موضوعہ قائم کر کے کہ 'فارسی شاعری میں سرشاری اور خود رفتگی کا جذبہ انسانی زندگی کے دوسرے مناسبات سے آزاد ہو کر ایک خود مختار حیثیت اختیار کر لیتا ہے' اردو شاعری اور نثر کے اس امتیاز سے زیادہ قرب محسوس کرنے لگے تھے کہ اس میں روز مرہ کی معمولی زندگی کا احساس بہت قوی ہے۔ عام زندگی کے متعلقات سے روز مرہ کے لب لہجے کے ذریعے تعلق قائم کر کے عام زبان کو پیچیدہ مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنانے کے لحاظ سے وہ اردو شاعری کی اس مرکزی رو کا سب سے بڑا نمائندہ میرؔ کو سمجھتے تھے، جس نے انفرادی تجربے کو اجتماعی زندگی سے جوڑ کر انا اور غیر کی دوئی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں غالب کی ''مفکرانہ'' شاعری کو وہ اردو شاعری کی اجتماعی زندگی میں شرکت والی روایت سے الگ جان کر اس کے ادبی اسلوب اور مجرد خیالات کی شاعری سے وابستگی نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ غالب کے فنی رویے دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کے غماز ہیں۔

میؔر اور غالبؔ کے فنی شعور کے تناظر میں عسکری کے اپنے مزاج کے تعین کا وافر سامان بھی موجود ہے ۔چونکہ وہ ادبی تجربے کو انفرادی محسوسات کا زائیدہ مان کر اس کی قدر و قیمت کا تعین دوسروں کے/اجتماعی تجربے کے پس منظر میں کرنے کے قائل تھے، جس میں کسی فنکار کی اپنی آرزوؤں اور امنگوں کی آزمائش گردو پیش کی زندگی اور دوسرے انسانوں کے جذباتی وفکری عوامل اور خواہشات ومفادات سے ٹکراؤ میں ہوتی ہے، اس لیے عام زندگی کے مناسبات سے عسکری کو ایک طبعی لگاؤ تھا۔ اسی لیے وہ مزاجاً ''عالم'' اور'' مفکر''نہیں تھے۔ انہیں علم، فکر، فلسفے، مجرد مسائل، ذہنی تعقلات اور ان کے دیگر متعلقات سے اس وقت تک کچھ خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی جب تک وہ عام انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی، قومی وثقافتی امور، تہذیبی وتمدنی شعور، یا ملک قوم کے وجود کے لیے مسئلہ بننے کے حوالے سے زیر بحث نہ آتے ہوں۔ان کے عالم یا مفکر نہ ہونے سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں وہ کوئی کم پڑھے لکھے یا سوچ بچار کی عام صلاحیت سے عاری انسان تھے بلکہ صرف یہ کہ وہ مجرد فکر اور مجرد علم کے آدمی نہ تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے، اتنے بڑے عالم کہ بیسویں صدی کی ادبی، فنی ،تنقیدی، تہذیبی، معاشرتی، کلچری اور بصری فنون کی علمی وتحریکی جہت کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس میں وہ اپنے ہرفکری دور میں انہی شعبوں کے اپنے دیگر ہم کاروں سے فرسنگوں آگے نہ رہے ہوں۔ اسی طرح وہ ''مفکر'' بھی تھے مگر انہی معنوں میں جن میں میؔر ایک فکری شاعر تھے۔ جس طرح میر کی فکری جہت سے انکار کرکے کوئی اپنی سلامتیِ طبع کا جواز نہیں رکھ سکتا اسی طرح عسکری کی تنقیدی کاوشوں میں فکری عنصر کا انکار کرنے والا بھی محض اپنی عصبیت ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ جس طرح میؔر سے بیدلؔ کی زبان اور لب لہجے کی توقع کرنا فضول ہے، اسی طرح عسکری سے مولانا فضل حق خیر آبادی کی سی'' فکر'' کی امید رکھنا بھی خوش ذوقی کی دلیل نہیں ۔عسکری ''فکرِ معقول'' کے نہیں'' فکرِ محسوس'' کے آدمی تھے ۔ان کے ہاں فلسفیوں کی فکر سے نہیں بلکہ فن کاروں کی فکر سے بحث ہوتی ہے۔

اپنے مضمون''اتباعِ میؔر'' میں میر کے اس تصور کو رد کرتے ہوئے کہ'' میؔر کی شاعری فکر کے عنصر سے خالی ہے، یا میؔر سوچ نہیں سکتے تھے،محسوس کر سکتے تھے، یا میؔر کے شاعرانہ تجربات میں تفکر سے زیادہ جذبات کو دخل ہے'' عسکری نے لکھا تھا کہ:

> ''اول تو یہی ثابت کرنا دشوار ہے کہ میؔر کی شاعری تفکر کے عنصر سے بالکل ہی عاری ہے۔ممکن ہے کہ خالص مابعد الطبیعیاتی اور مطلق تفکر میؔر کے بس کا نہ ہو، اور اس قسم کا تفکر ہر بڑے شاعر کے لیے لازمی بھی نہیں۔ لیکن زندگی کی حقیقتوں پر غور وفکر کرنا ،اس تفکر کو احساس کی شکل میں بدلنا، دوسری طرف ذاتی احساسات کے متعلق معروضی طریقے سے سوچنا، پھر اس متنوع تفکر اور احساس کو حل کرکے ایک نیا تجربہ تخلیق کرنا ، یہی تو میؔر کی شاعری ہے۔ بلکہ میر کی عظیم تر شاعری میں فکر اور احساس کے عناصر اس طرح شیر و شکر ہوگئے ہیں کہ یہ بتانا بالکل ناممکن ہے کہ پلہ کس کا بھاری ہے۔'' [۱۵]

اسی طرح ہوسکتا ہے کہ عسکری کے ہاں بھی مابعد الطبیعیاتی اور مطلق تفکر نہ ہو۔لیکن جدید تہذیب اپنی تاریخ کے جن مراحل سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچی ہے، اس کے پیچھے فکر وفلسفے کے جو دھارے کام کر رہے تھے مثلاً عیسائیت کے مذہبی

معاشرے سے سائنسی انقلاب تک اور صنعتی تہذیب سے لے کر ''جدیدیت'' کے مختلف مراحل اور پھر مابعد جدید فکری انتشار جس کا انعکاس فلسفیوں سے لے کر فنکاروں تک میں ہوا ہے، ان سب کا مطالعہ اور اس کے اسباب و نتائج پر سوچ بچار کرنا کیا فکر کے مناسبات سے عاری کسی ذہن کے لئے ممکن ہے؟ ہماری ادبی تاریخ میں ان مسائل کا شعور عسکری سے بڑھ کر کس کو تھا؟ کیا اپنے افسانوں سے لے کر تنقید تک انہوں نے مغربی تاریخ کے فکری عناصر اور احساس کو شیر و شکر کر کے پیش نہیں کیا؟ یہی اصل میں ان کا مزاج تھا اور احساس و فکر کا یہی ''شیر و شکر پن'' انہیں پسند بھی آتا تھا۔ مظفر علی سید کے نام ۱۹۷۵ء کے ایک خط میں انہوں نے خاقانی کے بارے میں یہ جملہ لکھا تھا کہ ''نقاد خاقانی کے شکوہ کی تعریف کرتے ہیں، مجھے علمیات کو پانی کرنے کا فن پسند آیا''۔[۱۶] فکر کو احساس میں تحلیل کرنا ہی علمیات کو پانی کر دینے کا فن ہے۔ عسکری کے علم و فضل میں بس یہی'' خامی'' تھی کہ ان کے قلم سے بہنے والا علم پانی ہوجاتا ہے اور خالص علم اور گاڑھے فلسفوں کو اصطلاحاتی زبان میں بیان کرنے کا عادی ذوق اس کی لطافت کو اپنی گرفت میں نہ پا کر مٹھیاں بھینچنے اور دانت کچکچانے لگتا ہے۔

ان کے مضامین ''ہیئت یا نیرنگ نظر''، ''فن برائے فن''، ''انسان اور آدمی''، ''آدمی اور انسان'' اور وقت کی راگنی کے اکثر مضامین میں اگر کوئی کمی ہے تو یہی کہ وہ منطقی مقولوں کے بجائے فنکارانہ محسوسات کی زبان میں ہیں ۔یہی اس دور کا میڈیم ہے، جسے عسکری نے حدِ کمال تک پہنچا دیا ہے ۔معجزے کے امکان کو رد تو نہیں کیا جاسکتا مگر غالب امکان ہے کہ معقولیوں اور منطقیوں کی مدرسانہ اصطلاحی زبان، جس کی اہمیت اپنی حدود میں مسلّم ہے، اب زمان حال تا مستقبل بعید، قبولیت عامہ حاصل نہیں کر پائے گی اور فکر معقول کو بھی اب فکر محسوس کا لباس زیب تن کرنا ہوگا۔ یہ پستی مذاق ہی کی بات سہی ،لیکن عسکری کے''عامیانہ'' ذوقِ عجز نے یہ نکتہ خوب سمجھ لیا تھا۔ پھر ایسا عجز بھی کسے ملتا ہے جو خود کو دوسروں سے کم تر کہنے کو ہی انکسار نہ جانے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھا کرے۔

بلند است آں قدر ہا آشیان عجز ما بیدل

کہ بے سعی شکست بال و پر نتواں رسید ایں جا

جدید اردو تنقید کی تاریخ میں عسکری ایک ایسے نقاد تھے جو نہ کبھی خود چین سے بیٹھے اور نہ اپنے مخاطبین اور معترضین کو کبھی سکون سے بیٹھنے دیا ۔ ان کی حمایت اور مخالفت میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ سوائے سرسید اور حالی کے شاید ہی کوئی اس معاملے میں ان کے قریب پہنچ سکے۔ ہماری ادبی اور فکری تاریخ میں عسکری کی اہمیت محض اس بنا پر نہیں کہ انہوں نے بعض تہذیبی اور ادبی مسائل پر انتہائی منفرد انداز میں روشنی ڈال کر اچھوتے حل پیش کیے ہیں بلکہ ان کے اہم ترین کارناموں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے زندگی، ادب اور کلچر کی کچھ ایسی جہتوں کی طرف متوجہ کیا جن کی طرف توجہ تھی ہی نہیں یا ان پر سرسری سی نظر ڈال کر'' حل شدہ پرچہ''سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔مواد اور ہیئت، ادب اور زندگی، ادب اور پروپیگنڈا،نظریاتی ادب، اسلامی ادب، پاکستانی ادب ،پاکستانی کلچر، اسالیب بیان اور تخلیقی تجربہ، ادب قاری اور ادیب کا تعلق، ادب کا فنکار کی ذات سے،تعلق ترجمے کے مسائل اور ان کا تخلیقی ادب سے رشتہ،مغربی ادب اور ہر ادب کا اپنی

باطنی زندگی یا تہذیب و مابعدالطبیعیات سے تعلق کے مباحث۔ ان میں سے ہر مسئلے پر عسکری نے نہ صرف سب سے الگ راہ نکالی بلکہ یہ احساس بھی دلایا کہ بظاہر سادہ ترین نظر آنے والا مسئلہ بھی اتنا سادہ نہیں ہوتا۔ مثلاً طرز احساس اور پیروی مغربی ہی کو لیجیے، ادب میں صفات کے استعمال اور محاوروں کا معاملہ لیجیے، رسم الخط اور زبان کی باطنی رو کو دیکھیے، ہوسکتا ہے کہ ان امور پر عسکری کے جوابات غلط ہوں، مگر ان امور میں جن پیچیدگیوں کی انہوں نے نشاندہی کی ہے، کیا وہ ایسی تھیں جو ہمارے ادبی شعور کے لئے روز مرہ کی باتیں ہوں؟ سادہ ترین جملے کو ہی اصل خوبی ماننے والے ذہنوں کے لئے خیال اور تجربے کی وحدت کو گرفت میں لانے والے اسلوب کے مسئلے کو پیچیدہ، عسکری نے نہیں بنایا، بلکہ انہوں نے ہمیں ہماری سادہ لوحی کا احساس دلا کر اس پہلو پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ادب کو ایک تہذیبی واردات کے طور پر پڑھنے اور اس کی تبدیلی رفتار اور معیار کے اتار چڑھاؤ میں قوم کی باطنی زندگی اور تہذیب کی تخلیقی و روحانی قوت اوراس کے معیارِ صحت کو ماپنے کا ہنر بھی انہی کی فکری نہج کی بدولت ہمیں میسر آیا ہے۔ ان کے نتائج فکر سے اختلاف کے دروازے ہر دور میں کھلے رہے ہیں۔لیکن ان سوالات کے ایسے حل جو ان تمام پیچیدگیوں سے نبرد آزما بھی ہوں اور جو عسکری جیسی بصیرت اور اسلوب میں اس طرح پیش کیے گئے ہوں کہ مشرق ومغرب کے زندہ و پیچ دار مسائل سے اتنی دیر بھی آنکھ ملا سکیں، آسان بہر حال نہیں۔

عسکری پر یہ اعتراض کہ وہ ہمیں کسی فن پارے کے فنی رموز سے آشنا نہیں کرتے اور صرف معنی ومفہوم یا تہذیبی اقدار کی بات کرتے ہیں، اگر درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو ان کی اس ''کوتاہی'' کو محض فنی و جمالیاتی معیاروں کا علم بلند کرنے والی ''جدیدیت'' کی ادبی مہمات کے تناظر میں رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ ادب کی غیر جمالیاتی اقدار اور ماورائی مؤثرات کو نظر انداز کرکے اس نے ادب کو کہاں لا کھڑا کیا ہے؟ ان امور کی ایک جھلک شمیم حنفی کے اُن مضامین میں دیکھی جاسکتی ہے جو اردو ادب کی موجودہ اور تہذیبی صورتحال یا جدید حسیت وغیرہ کے عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ہمیں پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اس صورتحال کا اندازہ نہیں ہو پاتا جو ہندوستان کے اردو ادب میں وہاں کے'' زمینی حقائق'' کے فقدان (یا شائد ان کے خوف) کے سبب پیدا ہوگئی ہے۔ ہمارے اعتبار سے اگرچہ پاکستان میں بھی صورتحال کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں، لیکن اپنے ہاں کے'' خالص ادب'' کی صورتحال کو شمیم حنفی جب پاکستانی ادبی معاشرے کے تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں(جہاں ان کے دیے ہوئے آصف فرخی کے ایک اقتباس کے مطابق ''ہمارے (پاکستان) جیسے معاشرے میں ادب خاموش تماشائی نہیں بنا رہ سکتا اور اس کشمکش اور تناؤ کا اظہار کرتا ہے جس سے کوئی قوم گزر رہی ہے...'') تو لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اردو ادب میں ''جدیدیت کے میلان کی یک رخی تعبیر میں اس فکر کی یہ جہتیں نظر انداز کردی گئیں''، تھیں جن میں'' سماجی اور سیاسی تجربوں ،تاریخ کے ایک مثبت تصور ،اجتماعی اقدار سے وابستگی اور نئے لکھنے والوں کی سماجی ذمہ داری کے احساس کی گنجائش تھی''ہندوستانی اردو ادب کی اس صورت (جسے عسکری'' سماجی تجربے سے محروم، خالص ادب'' کہتے تھے) کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے شمیم حنفی مزید لکھتے ہے:

''فکری اور اخلاقی لحاظ سے یہ دور زوال کا ہے اور زیادہ تر لکھنے والے بہ حیثیت ادیب اپنی ذمے داری اور منصب کے احساس سے محروم ہیں اور معاشرے میں اس محرومی کے اظہار کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس عہد

کی اخلاقی جدوجہد سے زیادہ تر لکھنے والے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے ۔اردو کے جو رسائل ان دنوں نکل رہے ہیں ان میں سے دو ایک کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کو یہ توفیق ہوئی ہو کہ ادب کے فکری ،تہذیبی اور اخلاقی رول پر دھیان دیں ۔حیرت بلکہ عبرت کا مقام ہے کہ موجودہ انسانی صورت حال اور اس کو درپیش مسائل کی سنگینی کے باوجود ہمارے ادیبوں کا ایک حلقۂ ادب کے سماجی رول اور معنویت سے منسلک باتوں کو غیر ضروری سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو ان سے لاتعلق قرار دیتا ہے ...ہمارے موجودہ ادبی معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ممتاز اور معروف ادیبوں ،خاص کر ادب اور ادبی تجربوں کی وضاحت کا بوجھ اٹھانے والے دانش وروں اور نقادوں کی اکثریت ادب اور زندگی کی حقیقت کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنے کی عادی ہے اور جن ادیبوں کے یہاں انسانی سروکار کچھ نمایاں ہیں ان میں سے بیشتر ادب کے مطالبات اور تخلیقی اظہار کی ذمے داریاں سنبھالنے سے قاصر نظر آتے ہیں ۔اردو کی ادبی تاریخ کے کسی دور میں تخلیقی ادب پر تنقیدی تصورات اور اصول (Theories) کی برتری کا ایسا تماشا کبھی نہیں دیکھا گیا۔'' [۱۷]

شمیم حنفی کے ان خیالات بلکہ الفاظ تک کو سابقہ صفحات میں آمدہ ایسے ہی امور کے تناظر میں عسکری کے ۵۵۔۱۹۵۴ء کے خیالات ولفظیات کے پس منظر میں دیکھیے تو ان کی بصیرت کا انداز ہوتا ہے جب وہ ترقی پسندوں کے مقابلے میں اپنے ہاں کے ان جدیدیت پرستوں کے رجحانات پر حیرت کرتے تھے جو اپنے زعم میں یورپ کی کسی ادبی روایت کے تتبع میں صرف ''ادب کے اندر'' رہنے کے نام پر ہر قسم کے سماجی وقومی معاملات سے خود کو الگ کر رہے تھے۔ اس پس منظر میں عسکری نے جن فنی رموز اور جمالیاتی اقدار کو نظر انداز کر دیا، ان کا ازالہ تو چلیے شمس الرحمٰن فاروقی کی شورا نگیز شرح میؔر کے ذریعے ہوجائے گا ،اگر چہ ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اپنے معرکہ آرا کارنامے شعر شور انگیز میں کلاسیکی ادب کی بازیافت کے ذیل میں غزل کی شعریات اور رسومیات کے ساتھ ساتھ اس کے تصور کائنات کو بہت بنیادی عنصر قرار دینے کے باوجود جب وہ میؔر و دیگر اساتذہ کے اشعار کی تشریح کرتے ہیں یا داستان کی شعریات بیان کرتے ہیں تو ان کے ہاں، مثلاً،غزل کی رسومیات وشعریات کا تجزیہ اور شعر کے نت نئے معنی نکالنے کا ذوق تو خوب نظر آتا ہے،مگر کلاسیکی فارسی اور اردو ادب کو جنم دینے والے تصورِ کائنات کے باب میں ان کی تحریروں میں ایک گھمبیر سناٹے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ آخر کیوں ؟؟ ایسے میں ادب کی تہذیبی اقدار اور ثقافتی و تاریخی منابع کو نظرانداز کر کے جس قسم کا ادبی شعور پیدا ہوگا اس کی تلافی تو مابعد جدیدیت سے بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ عسکری کے حدود اور مفہوم میں اسے ان مذہبی و مابعد الطبیعیاتی امور سے کچھ لینا دینا نہیں جو کسی قوم اور اس کے پیدا کردہ فنی مظاہر کی روح ہوتے ہیں۔

شمیم حنفی نے اردو ادب کی جس مذکورہ بالاصورت حال کا نقشہ کھنچا ہے وہ اگر چہ صرف ہندوستان کے پس منظر میں ہے، پاکستان کے وہ بلند ادبی وتہذیبی آدرش جو عسکری کے پیش نظر تھے، ان کے پس منظر میں تو یہاں بھی کوئی قابل رشک حالات نہیں۔لیکن پھر بھی یہاں عسکری کے وہ اثرات کسی نہ کسی انداز میں ضرور موجود ہیں جو ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندی کو حد اعتدال کا راستہ دکھاتے ہیں۔ جدید اردو تنقید پر عسکری کے ایسے ہی اثرات کی طرف شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک سوال کے جواب میں یوں اشارہ کیا تھا:

''رہا یہ کہنا کہ بیس پچیس برس کے بعد اب عسکری صاحب کا احیا ہورہا ہے تو میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دراصل عسکری صاحب کی تنقید کا اثر ونفوذ کبھی اردو ادب میں کم نہیں ہوا ...ہندوستان کے نئے لوگوں نے، یعنی ہمارے بعد آنے والوں نے، کم ان کا ذکر کیا ہے...(لیکن) پاکستان کی بات دیگر ہے۔ وہاں ان کی بات تقریباً مستندرہ چکی ہے اور بڑی حد تک اب بھی ہے۔''[۱۸]

اردو کی جدید ادبی اور تہذیبی صورت حال پرعسکری کے ایسے اثرات کا معاملہ اپنی جگہ ایک پوری کتاب کا متقاضی ہے۔لیکن یہاں ہم مختصراً چند اشارے کریں گے۔۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۸ء یعنی جزیرے کے اختتامیے سے لے کر عسکری کی وفات تک اردو ادبی تنقید اور تہذیبی تاریخ کا کوئی ایک بھی اہم پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں عسکری کا کوئی نہ کوئی ردعمل موجود نہ ہو۔اور مغربی ادب کا بھی کوئی اہم ادیب یا رجحان ایسا نہ ہوگا جس کو انھوں نے اردو میں متعارف نہ کروایا ہو، یا کم ازکم اس پر بات نہ کی ہو۔شمیم احمد نے اپنے مضمون ''' جدیدیت' سے 'جدیدیت کی فکری گمراہیوں تک' ایک سفر''میں مغرب کے ان ادیبوں اور دانشوروں کی ایک طویل فہرست گنوا کر جوعسکری کی وجہ سے اردو میں عام ہوئے، لکھا ہے کہ عسکری نے یورپ کے ادیبوں، شاعروں اورمصوروں کے جتنے ناموں سے اردو ادب کو آشنا کرایا اس کی پرچھائیں بھی ان سے قبل اردو ادب پرنہیں پڑی تھیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ انہوں ے اردو میں بعض ناموں کو اس وقت متعارف کروایا جب ان کا ذکر انگریز ی میں بھی اتنا عام نہیں ہوا تھا۔[۱۹] اس امر میں اگرچہ مبالغہ نظر آتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ صرف *جھلکیاں* کے مضامین ہی سے اس طویل فہرست کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ جب اردو میں ''جدیدیت'' کا سیلاب آیا تو اس کا راستہ ہموارکرنے والوں میں میراجی کے بعد تخلیقی اور تنقیدی سطح پر سب سے اہم نام عسکری ہی کا تھا۔ یہ نظریات ان کے لیے اوپر سے اوڑھے ہوئے کمبل کی طرح نہیں بلکہ ان کے وجود اورشعور کی ساخت میں شامل تھے۔اور ان کی ہنگامہ آرا تحریروں کی وجہ سے بعد میں یہ خیالات مستقل طور پر اردو کے ادبی اور تنقیدی مباحث کا حصہ بن گئے ۔اس کے علاوہ ترقی پسند نظریہ ادب سے اختلاف کا معاملہ ہو یا قیام پاکستان کے بعد اسلامی و پاکستانی کلچر اور ادب کا مسئلہ، ادب کے جمود وموت کی بحث ہو یا فرائیڈ، یونگ اور رانک کی نفسیات کی روشنی میں تخلیقی ادب کی واردات کو سمجھنے کی مہم، عالمی سرمایہ پرستی و امریکی سازشوں کا پول کھولنے کی بات ہو یا عالم اسلام کے زر پرستی کے چنگل میں پھنسنے اور وہاں کے عوام کے تحفظِ حقوق کی آواز ،مشرق ومغرب کے شعور میں موجود بنیادی اور لاینحل مسائل کی جستجو ہو یا مغربی اور اردو ادب کی بنیاد میں کارفرما تصورحقیقت کی تشخیص کا مسئلہ، ان میں سے ہر پہلو پرعسکری نے خود تو لکھا ہی ہے، اپنی حمایت اور مخالفت میں بھی وہ تحریروں کا انبارلگواتے رہے۔ یادرہے کہ کسی شخص یا رجحان کے اثرات کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ اس کے بعد اس کی حمایت اورتقلید میں کوئی تحریک اٹھ کھڑی ہو۔ بلکہ اصل بات ہوتی ہے کہ کسی شخص نے اپنے دور یا مابعد کی عمومی فضا میں ہلچل کتنی پیدا کی اور اس کے اٹھائے ہوئے سوالات کی روشنی میں غورفکر کے کتنے دروا ہوئے ۔

اس حوالے سے دیکھیے تو سلیم احمد اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اگرچہ عسکری کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے لیکن ایک مذہبی طرز زندگی اور مابعد الطبیعیاتی طرزفکر کے حامل ہونے کی وجہ سے ان کا عمومی شمار واضح طور پرعسکری کے ہمنواؤں میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے ان سے قطع نظرعسکری کے اثرات کے حوالے سے ہم دو بالکل متخالف نقطۂ نظر کے

حامل ادیبوں کے ذکر کرتے ہیں جن کے ہاں کبھی اشارتاً اور کبھی وضاحتاً عسکری کا ردعمل نظر آتا ہے: ممتاز حسین اور شہزاد منظر۔ مارکسی و اشتراکی افکار ونظریات کو سمجھنے اور عقلی، سائنسی اور فلسفیانہ منہاج پر زور دینے کے اعتبار سے ممتاز حسین کا نام تمام ترقی پسند وں میں ممتاز ہے اور شاید وہ ان معدودے چند ترقی پسند نقادوں میں سے ہیں جنہوں نے عسکری کی زندگی میں ان کا نام لے کر ان سے اختلاف کیا تھا۔عسکری نے'' انسان اور آدمی'' لکھا تو ممتاز حسین نے ''انسان اور حیوان''،مشمولہ: نئے تنقیدی گوشے میں اس پر کچھ سمجھ کر اور کچھ بے سمجھے اعتراضات کیے اور اپنے بعد کے ایک مضمون'' پاکستانی معاشرہ اور اردو تنقید'' میں یہ انکشاف بھی کیا کہ عسکری نے اپنا مضمون'' آدمی اور انسان'' میرے اس مضمون سے زچ ہوکر لکھا تھا۔[۲۰] ان تحریروں میں ممتاز حسین نے بعض جگہ عسکری کی جس طرح غلط تعبیر کی ہے (سلیم احمد نے عسکری کے ان مضامین کے بارے میں جو باتیں اپنی کتاب *عسکری انسان یا آدمی* میں کیں ممتاز صاحب کے ہاں ان کی بھی درست تعبیر نہیں)اس سے قطع نظر اول تو یہی بات دیکھنے کی ہے کہ عسکری کے یہ مضامین جس وسیع ادبی پس منظر اور انسان کی جس وجودی گھمبیرتا سے بحث کرتے ہیں ممتاز حسین کی یہ تحریریں اس سے یکسر خالی ہیں اور ان میں عسکری کو'' زچ'' کرنے والی کوئی بات نہیں۔لیکن اس موازنے سے ہمارا مقصد عسکری کے اس'' اثر'' کی طرف اشارہ کرنا ہے جسے ممتاز حسین جیسے اہم ترقی پسند بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسا ہی حال ممتاز حسین کے مضمون'' رسالہ درمعرفت استعارہ''، کا ہے ،جسے عسکری کے'' استعارے کا خوف''، کا ردعمل کہنے میں کوئی باک نہ ہونا چاہیے، اس مضمون میں چند صفحات واقعی اچھے ہیں مگر باقی میں وہی قصہٗ ہبوط آدم سے بات چھیڑنے کا انداز اور انسان دوستی و انقلاب کی باتیں ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری انتہا اور مزاج کے نقاد شہزاد منظر کا معاملہ ہے، جنہوں نے عسکری کے تصورات پر بڑے تواتر سے لکھا ہے اور (پوری ایک کتاب لکھی ہے) جو لکھا ہے مطالعہ کر کے لکھا ہے۔لیکن عسکری کے تصور روایت کی طرح پاکستانی ادب والے مسئلے پر بھی انہوں نے نافہمی کا وہ ثبوت دیا ہے جو ان کی سخن فہمی پر سوالیہ نشان ہے۔عسکری کے'' تضادات'' اور ان کی فکری ناموافقی ر وعدم مطابقت کا ذکر کرنا تو فیشن میں داخل سمجھا جانا چاہیے۔مگر شہزاد منظر نے تو یہ حد بھی کر دکھائی ہے کہ اپنی کتاب *پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال* میں عسکری کے مضامین کی روشنی میں اسلامی و پاکستانی ادب کی مقدور بھر درست تعریف متعین کرنے کے بعد یہ تک لکھ دیا کہ ''پاکستانی ادب کیا ہے ،ادب میں کون کون سے عناصر یا خصوصیات شامل ہونے سے پاکستانی ادب وجود میں آئے گا،عسکری صاحب نے اپنے کسی مضمون میں اس کی وضاحت نہیں کی''۔[۲۱] ایسے نقاد سے عسکری کے تصور روایت کے بارے میں کسی درست تفہیم وتعبیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہتے کہ عسکری ،منٹو یا ممتاز شیریں نے ایسے تخلیقی ادب کا نمونہ فراہم نہیں کیا جسے پاکستانی ادب کہا جاسکے تو درست ہوتا ۔بہر حال ممتاز حسین، صفدر میر اور محمد علی صدیقی ہوں یا اس حلقے سے باہر شہزاد منظر یا مذہبی نقطۂ نظر سے عسکری سے اختلاف کرنے والے علماء ونقاد ،عسکری کے اثرات بصورت ردعمل سب پر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس بحث میں اگر ہندوستانی اردو ادیبوں کو بھی شامل کر دیا جائے تو یہ فہرست اور بھی طویل اور عسکری کا دائرہ''اثر'' اور بھی وسیع ہوسکتا ہے۔[۲۲]

ایک ایسے ہی پس منظر میں سراج منیر نے یہ جملہ لکھا تھا کہ ''محمد حسن عسکری مرحوم اردو ادب میں قطبی ستارہ تھے

،کوئی اس کی سمت چلا یا مخالف، رخ کا تعین اسی سے کیا''[۲۳] سہیل احمد خان نے ایک دفعہ اردو کے تمام معاصر نقادوں سے عسکری کا موازنہ کرتے ہوئے یہ دلچسپ فقرہ کہا تھا کہ ''عسکری کے عہد کے سب نقاد آج اپنی اپنی کتابوں میں بڑے سکون سے استراحت فرما ہیں، مگر عسکری نہ اپنی زندگی میں خاموشی اور سکون کے قائل تھے اور نہ آج اپنی وفات کے بیس پچیس برس بعد خاموش ہیں''۔ (راقم سے ایک گفتگو) یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو عسکری کے معاصرین میں کم ہی کسی کے حصے میں آیا ہوگا۔مبین مرزا نے اپنے طویل سلسلہ مضامین ''محمد حسن عسکری نیا مطالعاتی تناظر'' کے آغاز میں پچھلے چند برسوں میں اردو کی تنقیدی و اشاعتی دنیا کے کچھ مظاہر کی روشنی میں عسکری کے بار بار زیرِ بحث آجانے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ کہنا صورت واقعہ ہے کہ

> ''ہماری تنقیدی تاریخ کے صدی بھر کے سفر میں اب آ کر یہ اعزاز تو صرف محمد حسن عسکری ہی کے حصے میں آ رہا ہے کہ آج فکر و نظر کے مختلف رویے بہ یک وقت ان کے افکار و سوالات سے بحث کر رہے ہیں اور ان کے کام کی قدر و قیمت کے تعین کے خواہاں ہیں ۔ اس میں ایک خاص بات لطف کی بھی ہے، وہ یہ کہ عسکری صاحب کے جہان تنقید سے رجوع کرنے والے یہ روّیے ایک دوسرے سے فکری بنیاد کے اعتبار بعد المشر قین رکھتے ہیں ۔ اس سے ہم محمد حسن عسکری کی تنقید کے دائرہ اثر کی وسعت کا اندازہ بہ آسانی لگا سکتے ہیں۔...پچھلے برسوں میں محمد حسن عسکری کی باز دید اور بازگشت اردو تنقید میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ایک بار پھر مستحکم کرتی ہے۔محمد حسن عسکری کا یہ revival کئی جہات رکھتا ہے ، مثلاً ایک تو یہ کہ ہمارے زمانے کا ایک بڑا کمرشل اشاعتی ادارہ (سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور) سب سے پہلے عسکری صاحب کی مارکیٹنگ ویلیو کا اندازہ لگاتا ہے اور دو ضخیم مجموعوں کی صورت ان کے تمام مطبوعہ کام کو مرتب کر کے شائع کرتا ہے۔ اس کے بعد لاہور کا ایک اور ادارہ عسکری صاحب کی غیر مدون تحریریں دو الگ اور ضخیم جلدوں میں تدوین کرا کے چھاپتا ہے۔ ان باتوں سے اور کچھ ثابت ہو یا نہ ہو کم سے کم ہمیں اتنا تو معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ اردو تنقید کے نئے تناظر میں بھی عسکری کی relevance موجود ہے اور یہ کہ یہ relevance محض تاریخی نوعیت کی نہیں ہے ، بلکہ عسکری کے اٹھائے ہوئے سوال اور چھیڑے ہوئے مباحث آج بھی اتنے زندہ اور توجہ طلب ہیں کہ ان سے نئی تنقید کے عصری تناظر میں بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا''۔[۲۴]

ایسے میں احمد جاوید کا یہ کہنا کہ ''نئے ذہن اور طرز احساس میں عسکری کے لیے ایک قدرتی مغائرت پائی جاتی ہے''۔ (مکتوب احمد جاوید، *دنیا زاد* ،شمارہ ۸، ص۲۰۰) راقم کے خیال میں پوری طرح یوں درست نہیں کہ یہاں جس قدرتی مغائرت کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا کوئی لازمی تعلق صرف اس نئے ذہن سے نہیں جس کے لیے ،بقول احمد جاوید، آصف فرخی نے اس مغائرت کو مٹانے یا سمیٹنے کی کوششیں کی ہیں۔ بلکہ عسکری کے حوالے سے یہ ''نیا ذہن'' ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور آج بھی ہے جس کے طرز احساس میں عسکری کے لیے ایک قدرتی مغائرت پائی جاتی ہے ۔جس قاری کے سامنے عسکری کے ذہنی سفر کی مکمل کہانی اور اس پر ہونے والا ردّعمل ہمہ وقت موجود ہو اس کے لیے اس نئے ذہن کی شناخت مشکل نہیں۔ ویسے تو عسکری پرانے ذہن کے مقابلے میں خود ایک نئے ذہن کے نمائندہ تھے مگر ان کی'' جدیدیت'' کی تشخیص میں ہم

بتا چکے ہیں کہ وہ ایک نیا ذہن ہوتے ہوئے بھی چند ازلی وابدی صداقتوں پر پختہ یقین اور ماضی کے ادب کے عظیم سایوں کا احساس رکھنے کے اعتبار سے دراصل جوانی میں بھی ''پرانے خیالات کے بزرگ'' تھے۔ ترقی پسندی سے جدیدیت اور پھر مابعد الطبیعیاتی تصور حقیقت تک کی جستجو میں عسکری کے اندر گہرے باطنی حقائق سے دل بستگی اور منزل کے حصول کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کی جرأت ہی عسکری کا وہ امتیاز تھا جو ان کے لیے ''نئے ذہن اور طرز احساس'' میں ہمیشہ سے مغائرت کا سبب تھا۔ آج اگر کسی ''نئے ذہن'' میں یہ مغائرت کلی طور پر موجود ہے تو اس کا تعلق کسی نہ کسی انداز سے ضرور پرانے ترقی پسندوں یا صحیح تر الفاظ میں ان جدیدیت زدگان سے ہے جو کائنات کی روحانی تعبیر یا کم از کم عام زندگی اور ادب کے معاملات میں کسی مابعد الطبیعی اخلاقی نظام کے عمل دخل کے قائل نہیں اور زندگی اور کائنات کے بارے میں ''لبرل سیکولر'' نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔

عسکری اور ان کے تمام معاصرین کے مابین ایک زبردست فرق ہے۔وہ یہ کہ عسکری محض ایک گول مول اور ہر طرف لڑکھنے والا پھسلواں پتھر نہیں بلکہ تیکھے کونوں کناروں اور تیز دھار والی ایسی شخصیت کا نام ہے جو'' چبھتی'' بہت ہے۔ وہ ایک تعدیلی نہیں بلکہ برقیائی ہوئی شخصیت ہے جو دوسرے کو یا تو اپنی طرف کھینچتی ہے یا مزید پرے دھکیل دیتی ہے۔ ان کے دور میں ایک سے ایک بڑی شخصیت رہی ہے: پطرس بخاری، پروفیسر احمد علی، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر تاثیر، عزیز احمد اور منٹو وغیرہ ۔ان میں سے ہر ایک کے اپنے نظریات اور باہمی اختلافات بھی رہے ہیں ۔مگر آج کا نیا ذہن اور طرز احساس ان میں سے ہر ایک کے لیے سراپا عقیدت اور ان سے نظری اختلاف کے باوجود اپنی وسعت النظری کی خاطر انہیں اپنا کہتے نہیں تھکتا۔ مگر عسکری کے معاملے میں بہت سے اگر مگر لگا جاتے ہیں۔ اردو تنقید میں عسکری کے اثرات کا معاملہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر ان کی یہ ''چبھن'' بھی اتنی ہی درست ہے۔ سوال ہے کہ عسکری میں یہ ''کھٹک'' اور زہرناکی کیوں تھی جو ہر زمانے میں ہر کسی کو کہیں نہ کہیں ضرور چبھتی رہی ہے۔ یوں تو ان کی ساری تنقید ہی اس کا جواب ہے مگر خاص طور پر وہ مضامین جو *تخلیقی عمل اور اسلوب* میں زر پرستی اور تنقید کے حوالے سے موجود ہیں، اس سوال کا شافی جواب ہیں ۔۴۹۔۱۹۴۸ء میں انہوں نے ممتاز شیریں کے نام ایک خط میں اپنے لیے ایک آزاد، باغی اور بھگوڑے کی حیثیت پسند کی تھی جس کی وفاداری صرف صداقت، انصاف، ذہنی آزادی اور بلند انسانی آدرشوں کے ساتھ تھی ۔ پاکستانی ادب کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اس کی لازمی شرط سچائی اور حق کی گواہی قرار دی تھی، خواہ وہ اپنے ملک وقوم کے ''خلاف'' ہی کیوں نہ ہو۔ زر پرستی کے خلاف لکھتے ہوئے انہوں نے ادیب کے اندر ایک ایسے'' زہر'' کو ضروری قرار دیا تھا جس کا دوسرا نام صداقت اور آزادی ہے۔ مگر وہ صرف اپنے ذاتی وگروہی مفادات کو ہی صداقت نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح آزادی بھی ان کے نزدیک بے مہار نہیں تھی۔ اس کا ثبوت تو انہوں نے مسلم لیگی حکومت کے سیفٹی آرڈیننس کی مشروط حمایت اور آزادی اظہار کی راہ میں روسی اور مشرقی یورپ کے اشتراکی ملکوں اور مختلف گروہوں کی طرف سے حائل ممکنہ خطرات اور رکاوٹوں کا احساس دلا کر مہیا کیا تھا۔ اور ذاتی سطح پر حق اور صداقت کی دھن میں انہوں نے ساری زندگی آزادی کے ساتھ فیصلے کیے تھے: ترقی پسندوں کے خلاف لڑتے ہوئے بھی اور ان کے حقِ تحریر اور آزادی اظہار کے لیے اپنی حکومت کے خلاف صف آرا ہو کر بھی؛ اشتراکی نظریہ ادب کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے بھی اور زر پرست ملکوں کے

مقابلے میں روس کی حمایت کرتے ہوئے بھی؛ ترقی پسندی اور جدیدیت کے مناقشوں میں بھی اور جدیدیت کے خلاف علم اٹھا کر بھی انہوں نے تلاش حق اور آزادی کے ساتھ فیصلے کرنے کی اسی روش کو قائم رکھا تھا۔ وہ نہایت ہی غیر مصالحت پسند، Uncompromising اور بڑے سے بڑے مفاد کو ٹھوکر ماردینے والے تھے۔ انہوں نے اگر غلط فیصلے بھی کیے، اگر کبھی خود اپنی تردید بھی کی، تو اپنے عصبی تجربات کی گواہی پر، نہ کہ کسی کے لحاظ، لالچ یا خوف میں۔ ان کے اندر حق گوئی اور بے باکی کی یہی روش تھی جسے راقم نے زہرناکی یا ''چبھن'' جیسا نا ملائم نام دیا ہے۔ کیونکہ انہیں ''اللہ کا شیر'' کہنے میں ایک بلند آہنگ قصیدے کا تاثر ہے، حالانکہ یہ ان کے تاریخی نام ''اظہار الحق'' کا فطری لازمہ تھا۔

ترقی پسندوں کو وہ اس لیے ناخوش آتے ہیں کہ وہ ان کے مزعومہ مارکسی تصورادب کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ خالص ادب وتنقید (جدیدیت) والوں کو وہ اپنے نظریاتی موقف اور چند ہمہ گیر اخلاقی اقدار کو ادب میں منعکس دیکھنے کی وجہ سے ناپسند آتے ہیں۔ خالص اسلام والوں کو ان سے اس لیے اختلاف تھا کہ وہ کسی مجرد اسلام کے بجائے پوری اسلامی تاریخ اور اس میں جنم لینے والے تمدنی ،تہذیبی اور فنی مظاہر کو بھی اسلام کی تعمیری و تخلیقی قوت حیات کا حصہ سمجھتے تھے اور پھر آخر آخر انہوں نے جب مابعد الطبیعیاتی تصورحقیقت کو اہم جان کر اس کی روشنی میں مشرق ومغرب کے ادب کو پرکھ کر، مغرب کی تمام فکری گمراہیوں کو آوردہ ٔجدیدیت قرار دے دیا تو وہ تمام گروہ اور حلقے ،جنہیں عسکری پہلے ہی اپنے اپنے حسابوں ناپسند تھے، یک زبان ہو کر ان کی مخالفت پر اتر آئے کہ انہوں نے انسانی علوم و افکار اورتمدن و معاشرت کے پروردہ مغرب اور باقی پسماندہ وغیر مہذب دنیا کو انسانی ترقی کی معراج-- سائنس اورٹیکنالوجی --کا تحفہ دینے والی جدید تہذیب کو گمراہ کہہ دیا تھا۔ اپنے ایسے ہی دوٹوک روّیوں اور محاکموں کی وجہ سے آج اردوتنقید میں عسکری جیسا کوئی ایک بھی'' نک چڑھا'' نقاد اور زہر ہلاہل کو قند کہہ کر اپنوں بیگانوں کو خوش کرنے والا'' باغی'' موجود نہیں ۔آج یا کبھی اگر اردو ادب،تنقید،تہذیب،مشرقی ومغربی طرز احساس اور روایت کے بارے میں عسکری کے تمام نتائج غلط بھی ثابت ہوگئے تب بھی ذہنی آزادی اورآرزوئے صداقت کی وہ لگن کبھی بے معنی نہیں ہوگی جس کا نام''عسکری طرزتنقید'' ہے ۔سلیم احمد نے نظیر صدیقی کے ایک'' معنی خیز'' مشورے کے جواب میں انہیں لکھا تھا کہ'' تم نے لکھا ہے کہ میں عسکری کو عبور کرنے کی کوشش کروں۔عسکری کوعبور کرنا ممکن ہے،لیکن عسکری میں جو 'سچ' ہے اسے کیسے عبور کروں''؟[۲۵]

مسلمان قوم، اسلامی کلچر، پاکستانی ادب ،ترقی پسندی و جدیدیت کے مسائل اور اس دور کے حاوی سیکولر نظریۂ حیات میں ایک باشعور اور باوقار قوم کے طور پر زندہ رہنے اور مغرب کی تہذیبی یلغار کے مقابلے میں ایک مذہبی طرز احساس کا سبھاؤ رکھنے والے ادب اور نظام اقدار کے امکان پر جب بھی کوئی مفکر یا نقاد بات کرے گا اسے عسکری کے سے اوبڑکھابڑ راستوں سے بھی گزرنا ہوگا اور ان کے تصورات سے اپنا معاملہ بھی ضرور صاف کرنا ہوگا۔ ورنہ بقول مبین مرزا اسے ان دیوار چاٹنے والوں کے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جو اپنے تئیں عسکری کو ٹھکانے لگا کر جب اگلے روز بیدار ہوتے ہیں تو اپنے سامنے پھر پورا عسکری موجود پاتے ہیں ۔

اصل میں بڑے عسکری نہیں تھے، وہ سروکار اور مسائل بڑے تھے جن سے انہوں نے اپنے دور کے بڑے مغربی

ادیبوں کی موجودگی میں برسرِ میدان پنجہ کشی کی تھی اور بقدر ہمت اپنی اقدار، تصورات اور معیارات کی شرط پر مغرب کے سیل بے پناہ میں قدم جمانے کوشش کی تھی۔ انہوں نے گنجلک فلسفوں اور مجرد افکار کے زور پر نہیں بلکہ محض اپنے ادبی تجربات کی بنا پر مغرب کی سراپا آتشِ روح کو اُسی طرح بے نقاب کر دکھایا ہے جس طرح ڈی ایچ لارنس نے ۲۲-۱۹۲۰ء میں اپنے چند ماہی قیامِ امریکہ کے بعد وہاں کے چند فکشن نگاروں کے مطالعے سے امریکی نفسیات، سماج، نظام اور تاریخ کی روح کھینچ کر رکھ دی تھی۔ اس اعتبار سے عسکری کی تنقید-- درحقیقت ماورائے تنقیدی کاوشوں-- کی مماثلت لارنس سے بہت زیادہ ہے۔ اُس کے ''منتخب نقدِ ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے عسکری نے جو یہ الفاظ لکھے تھے:

> ''لارنس کی نظر ان امتیازات کے سلسلے میں اس قدر عقابی تھی کہ کتابوں پر اس کی آراء کو پڑھنا ایسا ہے جیسے ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، اس کے قلب کی گہرائیوں کا مشاہدہ کر رہے ہوں اور خود اپنے باطن کی عمیق ترین کشمکشوں سے بھی آشنا ہو رہے ہوں۔ میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت بھی کرنے کو تیار ہوں کہ اگر آپ نے اس کے تنقیدی مقالات کا مطالعہ نہیں کیا تو آپ اپنے زمانے اور اس کے تاریک لمس کی تلاش سے آشنا نہیں ہیں''۔[۲۶]

بالکل یہی کچھ عسکری کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی نے ان کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کیا تو وہ اپنے زمانے اور اس کے تاریک لمس کی تلاش سے آشنا نہیں جس سے بیسویں صدی کی روح عبارت ہے۔ اور اسی لیے لارنس کی طرح عسکری کو بھی (انہی کے الفاظ میں) ''محض ایک نقاد ادب کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا''۔ ہمارے دور میں انہوں نے وہی کام کیا جو اپنے زمانے میں اقبال نے کیا تھا۔ اقبال کے بعد ہمیں اپنی قومی و تہذیبی تاریخ میں ایک بھی آدمی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن سوالوں سے الجھا ہو جن پر عسکری نے ہاتھ ڈالا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض موقعوں پر وہ اُس شے کے شکار بھی ہوئے ہوں جسے مظفر علی سید 'معاصر ادب کے محاکمے کے سلسلے میں ایک نقاد کے لیے لازمی پیشہ ورانہ خطرہ یعنی تعصب، کم نظری یا خود تردیدی کہتے ہیں۔ لیکن اصل شے عسکری کا وہ تنقیدی عمل، ادبی بصیرت اور پیشہ ورانہ خطرہ مول لینے کی وہ جرأت ہے، جس کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون 'ہمارا ادبی شعور اور مسلمان' کے ابتدائی صفحات میں یہ کہتے ہوئے کہا تھا ''ہم غلط باتیں سوچنے سے نہیں ڈریں گے۔ بلکہ تعصب، تنگ نظری اور جلد بازی سے بھی نہیں شرمائیں گے (کیونکہ) اصل چیز تو بات کہنا ہے''۔ یعنی سوچنے اور کہنے کی جرأت! عسکری دوسروں سے اختلاف کرنے اور بڑی بڑی بات کہنے سے ڈرتے نہیں تھے۔ یہی جرأت انہوں نے قاری کے اندر بھی پیدا کرنا چاہی تھی کہ اسے لکھنے والے کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرتے رہنا چاہیے۔ اس تمام جرأت و بے باکی کے باوجود کہ جس کا مظاہرہ انہوں نے ادب کو محض دل لگی اور ذریعۂ تفریح جان کر پڑھنے کے روّیے کے رد میں اپنی معاصر ادبی صورت حال کا اڑتیس برس تک باریک بینی سے مطالعہ اور نہایت گھمبیر نتائج اخذ کرنے کے دوران کیا، ایسا بہت کم ہوا کہ انہوں نے اپنے کسی معترض کا جواب اس کا نام لے کر دیا ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ جرأت کے فقدان کا معاملہ تھا یا کیا، بہر حال ان کے اس عمل میں بھی سیکھنے کا بہت سا سامان ہے۔ انہوں نے جو کچھ سوچا وہ درست تھا یا غلط، اور ان کی جرأت کا رخ صحیح تھا یا نہیں، اسے چھوڑیے۔ اصل بات یہ ہے کہ عسکری کی سوچ بہت منفرد اور جرأت لائق تحسین تھی۔ مگر ان کے اس طریق کار پر عمل کرنے میں جوکھم بھی بہت ہیں۔

عسکری جیسی ذہانت، علم، ذکاوت، عقابی نظر، اخذ نتائج کی حیرت انگیز صلاحیت، اور سب سے بڑھ کر کوہ ہمالیہ جیسی قناعت اور بے خوفی، کے بغیر ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔

ماضی اور حال کے ادب، مشرق ومغرب کے طرزِ احساس، ادب کی بنیاد میں کارفرما تصورِ حقیقت کی تشخیص اور اس کسوٹی پر ادب، زندگی، تہذیبی اقدار، مذہبی تصورات اور اپنے فکروعمل کے تمام گوشوں کو از سرِنو پرکھ کر نیو ورلڈ آڈر کے بعد کے معرکۂ خیروشر میں اپنا مقام بنانے کے مسائل سے الجھنا اگر کوئی بامعنی اور ضروری کام ہے تو عسکری کے زمانے کی ادبی تنقید میں یہ کام تنقید کے سروکار نہیں سمجھے جاتے تھے۔ جدید اردو تنقید میں یہ افقی وسعت بھی عسکری ہی نے پیدا کی۔ اردو اہلِ فکر دانش یہ کام عسکری سے پہلے بھی یقیناً کرتے تھے۔ اسی امر کا جائزہ انہوں نے اپنے مضمون ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' میں لیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا اہلِ قلم طبقہ اپنے اس فرض سے کنی کترانے لگا ہے۔ اس اعتبار سے عسکری نے ایک طرف اہلِ دانش کو اپنا بھولا ہوا سبق یاددلایا تو دوسری طرف جمالیاتی و ادبی جدیدیت کے زیر اثر تنقید کو محدود سی سرگرمی بنا ڈالنے کے زمانے میں نقاد کو وہ منصب عطا کیا جو'' مفکرین'' سے مخصوص تھا۔ اپنے مضمون'' تنقید کا فریضہ'' میں ان کا یہی موقف تھا کہ تنقید کے فرائض زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ عسکری کی تنقیدی سرگرمیوں کے آئینے میں ہمیں تنقید یا نقاد کے یہ فرائض دوطرح سے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جس کا اظہار ان کی تحریروں میں اپنے معاصرین کو ان امور کی طرف مائل کرنے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو ادب وتہذیب کے مختلف دائروں میں عسکری بذاتِ خود کرتے رہے ہیں۔

انہی معنوں میں میرا موقف ہے کہ عسکری کے دائرۂ عمل اور فکری سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے مروّجہ مفہوم میں نقاد کا لفظ ان کی علمی وفکری مہمات کا پورا احاطہ نہیں کرتا۔ اہم تر سوال یہ ہے کہ عسکری کے تمام تنقیدی سرمائے کی موجودگی میں'' کیا انہیں محض ایک نقادِ ادب کہہ کے ٹالا جاسکتا ہے''؟ اگر نہیں تو پھر عسکری اب تک کی طرح آئندہ بھی بامعنٰی رہیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے صرف مغربی نظریات وتصورات کی جگالی کی ہے، چند جنسی افسانے لکھے، روٹی کمانے کے لیے کچھ ناولوں کے تراجم کردیے، کبھی ترقی پسندوں سے لڑے، کبھی جدیدیوں سے الجھے، اور پھر عمر بھر کی عادت کے مطابق محض سنسنی خیزی کی خاطر پیرویٔ مغربی کا مسئلہ چھیڑ کر روایت کا جھگڑا کھڑا کر دیا اور ایک دن پڑھانے جاتے ہوئے چپکے سے گرے اور مر گئے تو پھر اردو کا تنقیدی شعور ان کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے آخر میں اردو کے پرانے شعرا کے معاملے میں روا رکھا تھا: یعنی انہیں آنکھوں پر بٹھایا، سلامیاں پیش کیں اور رخصت کر دیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون میں عسکری پر ڈاکٹر آفتاب احمد کا خاکہ'' محمد حسن عسکری۔ شخص اور دوست'' قندِ مکرر کے طور پر چھاپا تو اس کے مستقل سلسلے ''اس بزم میں'' میں لکھا تھا کہ:

> ''محمد حسن عسکری کے انتقال کو پچیس برس سے زیادہ ہونے کو آئے، لیکن ان پر گفتگو اب بھی پہلے ہی جیسی گرم ہے۔ اس میں کہیں کہیں معاندت کی لے بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ عسکری اگر بڑے آدمی تھے تو وہ اسے جھیل جائیں گے، بلکہ تنازعات سے ابھر کر ان کی عظمت اور بھی روشن

ہو سکتی ہے اور اگر عسکری چھوٹے آدمی تھے تو معاندت و مخالفت کے ذریعے ان کے اثر میں کم آ جائے تو کیا
فرق پڑتا ہے، ٹھیک ہی ہے۔،،[۲۷]

عسکری کی عقیدت مندیوں اور معاندت شعاریوں کی فضا میں یہی حرف توازن ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ عزیز ابن الحسن، اردو تنقید- چند منزلیں، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۳ء

۲۔ شیخ اکرام، ڈاکٹر، یاد گار شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ص ۷۰-۳۶۹

۳۔ صادق، ڈاکٹر محمد، محمد حسین آزاد-احوال و آثار، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۵۶

۴۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص ۵۵-۱۵۴

۵۔ سید وقار حسین، ''محمد حسن عسکری اور مرکزی روایت کا تصور''، مشمولہ: مشرق کی بازیافت، مرتبہ: قاسمی، ابو الکلام علی گڑھ، نئی نسلیں پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء

۶۔ خسرو، امیر، دیباچہ غرۃالکمال، ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ، کراچی، شہر زاد، ۱۴۲۵ھ، ص ۶۴، ۸۹، ۹۴

۷۔ ایضاً

۸۔ عسکری، محمد حسن، جھلکیاں، مرتبہ سہیل عمر، نعمانہ عمر، لاہور، مکتبۂ الروایت، ۱۹۸۱ء، ص ۷۴-۲۷۳

۹۔ ویسے تو یہ سارے مباحث عسکری کے ہاں موجود ہیں، مگر ادب میں زندگی کے اظہار کے انداز کے لیے ملاحظہ ہو سلیم احمد کا مضمون'' زندگی ادب میں'' مشمولہ: ادبی اقدار

۱۰۔ وقت کی راگنی، ص ۱۱۳

۱۱۔ عسکری، محمد حسن، ستارہ یا بادبان، علی گڑھ، علی گڑھ بک ڈپو، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۶

۱۲۔ عسکری، محمد حسن، ''ہیئت یا نیرنگ نظر'' مشمولہ: انسان اور آدمی

۱۳۔ ملاحظہ ہو نئی شاعری اور جیمس جوئس اور شیکسپیئر والی معروضیت کے بارے میں ان کے خیالات مشمولہ: *جھلکیاں*

۱۴۔ عسکری، محمد حسن، مقالات محمد حسن عسکری، جلد اول و دوم، مرتبہ شیما مجید، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء

۱۵۔ عسکری، محمد حسن، تخلیقی عمل اور اسلوب، مرتبہ محمد سہیل عمر، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۲

۱۶۔ عسکری، محمد حسن، مکاتیب عسکری، مرتب، شیما مجید، لاہور، القمر انٹر پرائزرز، س ن (قیاساً ۲۰۰۴ء)

۱۷۔ شمیم حنفی، ''اردو ادب کی موجودہ صورت حال''، مشمولہ: شعر و حکمت، کتاب ۲، دور سوم، ص ۱۰۰-۹۹، سابقہ جستہ جستہ اقتباسات ص ۹۷-۸۸؛ شمیم حنفی کے ایسے اور بہت سے خیالات ان کی دیگر تحریروں مشمولہ: خیال کی مسافت اور *دنیازاد*، ۱۳ میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۸۔ شب خون ،مدیر شمس الرحمٰن فاروقی، الہ آباد، اکتوبر ۲۰۰۲ء،ص۱۹

۱۹۔ شمیم احمد ،مشمولہ: محمد حسن عسکری ایک عہد آفریں نقاد، ص۱۷۔۲۱۶

۲۰۔ ممتاز حسین ، ادب اور روح عصر ، کراچی ، شہزاد، ۲۰۰۳ء،ص۶۱

۲۱۔ شہزاد منظر ، پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال،کراچی، منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء،ص۱۱

۲۲۔ ہندوستان میں عسکری سے اثر پذیر ہونے والے نقادوں کی تفصیل کیلئے دیکھیے شمس الرحمٰن فاروقی کا انٹرویو ،مشمولہ: شب خون، اکتوبر ۲۰۰۲

۲۳۔ روایت ، شمارہ ۱ ،ص۲۵۶

۲۴۔ ''محمد حسن عسکری نیا مطالعاتی تناظر''، مشمولہ: مکالمہ ۸، مدیر مبین مرزا، اکادمی بازیافت ، کراچی، ص۳۸۔۲۳۹

۲۵۔ مکتوب سلیم احمد بنام نظیر صدیقی ،مشمولہ نامے جو میرے نام آئے ،ص۱۶۵

۲۶۔ اصل انگریزی تبصرہ مطبوعہ پاکستان ٹائمز، لاہور، ۲۹ ستمبر ۱۹۵۶ء، ترجمہ مظفر علی سید، مشمولہ: فکشن -فن اور فلسفہ ، ص۲۱۲

۲۷۔ شب خون، اپریل ۲۰۰۴ء ،ص۸۰